Vol. 3 No.1 2019

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

ن۔م۔راشد کی اداریہ نویسی کا تحقیقی جائزہ

(A Research Study of N M Rashid's Editorial writing)

محمد ریاض عابد[1] عابد سلیم[2]

Abstract

The editorials are of utmost importance in the prose works of N.M Rashid. His editorials were published in the intellectual and literary magazines like "Ravi", "Nakhlistan" and "Shahkaar" respectively. He wrote on the different types of trends of his contemporary literature. He created guidelines for new intellectuals and poets for the betterment of the Urdu literature. He laid stress on literary criticism and genres of poetry. With a comparative study of classical intellectuals, he tried to assert their literary status. He prefers to Ghalib and Daagh over Zauq. He has denounced the poetry of Ibrahim Zauq. The reader can have a difference of opinion if he likes. We not only get an insight of his views on important issues through his editorials but these editorials are also the representatives of his literary style. After reading these editorials we come to the conclusion that Rashid is not only a prolific poet and also an excellent prose-writer too.

Keywords: N. M. Rashid, Editorial, Ravi, Shahkaar, Poetry, Critisiom

کلیدی الفاظ: ن۔م راشد، اداریہ، راوی، شہکار، شاعری، تنقید

اگرچہ اداریہ نگاری کی تاریخ بہت پرانی ہے لیکن ابھی تک اس کی کوئی حتمی تعریف سامنے نہیں آ سکی اور یہ سوال کہ اداریہ کیا ہے؟ اپنی جگہ قائم ہے۔ اگرچہ ماہرین صحافت نے اپنے اپنے انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن ان میں سے کوئی رائے بھی ایسی نہیں ہے جسے حتمی کہا جا سکے۔ ہم یہاں چند ماہرین کی آراء کی روشنی میں جاننے کی کوشش کریں گے کہ اداریہ کیا ہے۔ لاؤس ایم لائینز کے مطابق :

> "روائتی طور پر اداریہ اخبار کے ایڈیٹر کی رائے کا اظہار ہے۔ اخبار کے قارئین اداریے میں خبروں پر ایڈیٹر کی ججی تلی رائے چاہتے ہیں۔ اداریہ اخبار کے ایڈیٹر کی ججی تلی رائے کو ہی کہا جاتا ہے۔"1

لاؤس ایم لائنز کی اس رائے کو اگر ماضی کے حوالے سے دیکھا جائے تو درست معلوم ہوتی ہے لیکن جدید اداریوں پر اس کا اطلاق بالکل نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید عہد میں ایڈیٹر کی پوسٹ نے انتظامی سربراہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اداریہ کوئی اور لکھتا ہے۔ کارل جی ملر کا نظریہ کچھ اور ہے :

> "اداریہ اس مضمون کو کہتے ہیں جو کسی ہنگامی موضوع پر لکھا گیا ہو اور جس میں قاری کی سوچ ایسی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہو جو مضمون نگار کے خیال میں صحیح راہ ہو۔ اداریہ نویس قاری کو ایسے نقطہ نظر سے متفق کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسی باتیں لکھتا ہے جس سے قاری قائل ہو جائے اور موافق رد عمل ظاہر کرے۔ اداریہ نویس مختلف ترغیبی طریقوں سے کام لے کر قاری کے جذبات و احساسات کو جائز طور پر متاثر کرتا ہے۔"2

وینم۔ ایلن۔ وائٹ کے مطابق

۱۔ پی ایچ ڈی ریسرچ سکالر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور۔
۲۔ پی ایچ ڈی ریسرچ سکالر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور۔

Vol. 3 No. 1 2019
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

"اداریہ وقت کے رجحانات یا خبروں پر آزادانہ اظہار خیال ہونا چاہیے۔ جسے ایک ہمدرد اور عقلمند شخص نے جرأت کے ساتھ مختصر طور پر قلم بند کیا ہو۔ اداریے میں درشتی، تعصب اور خوف کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ یہ چیزیں خواہ کتنی ہی بے خوفی کی مظہر ہوں۔ اصل میں کمزوری کی علامت ہیں۔"3

ڈاکٹر سکین حجازی نے اداریے کی تعریف کچھ یوں کی ہے:

"اداریہ نویس کی طرف سے کسی ہنگامی موضوع پر مباحثے میں تحریری طور پر حصہ لینے کا نام اداریہ ہے۔"4

ن۔ م راشد نے اگرچہ لکھنے کا آغاز بہت پہلے کیا تھا لیکن اداریہ لکھنے کا آغاز اُنہوں نے اُس وقت کیا جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالہ "راوی" کے ایڈیٹر بنے۔ لیکن ایڈیٹر بننے سے پہلے راشد کے مضامین بھی راوی کی زینت بنتے رہے لیکن فیصل آباد کے رسالے میں لکھے جانے والے مضامین اور راوی میں چھپنے والے مضامین کے اسلوب اور زبان و بیان میں ایک نمایاں تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ پہلے لکھے گئے مضامین میں راشد کا انداز بیاں کچھ سادہ اور رومانوی سا ہے لیکن جب لاہور آئے تو پروفیسر لینگ ہارن ڈکنس، پطرس بخاری اور مدن بھوپال سنگھ جیسے لوگوں کے قریب رہنے کا موقع ملا اور یہی چیز اُن کے اسلوب میں تبدیلی کا باعث بنی ڈاکٹر سعادت سعید اپنی کتاب "راشد راوی میں" کے شروع میں "ن۔ م راشد کی چند نثری کاوشیں" میں لکھتے ہیں:

"گورنمنٹ کالج لاہور میں آنے کے بعد ن۔ م راشد کے مضامین کالج کے رسالے راوی میں چھپنے لگے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اُن کی طبیعت میں پطرس بخاری کی شگفتہ شخصیت کے زیر اثر مزاح اور طنز کی حس بیدار ہوئی۔ تنقیدی مضامین کے علاوہ اس دور میں وہ پیروڈی کی طرف متوجہ ہوئے۔"5

راوی میں چھپنے والے راشد کے مضامین میں جہاں طنز اور مزاح دکھائی دیتا ہے وہاں راشد کے اداریوں میں بھی اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو اُنہوں نے گورنمنٹ کالج کے زمانہ طالب علمی میں "راوی" کے لیے لکھے۔

فروری 1931ء کے راوی کا اداریہ اگر دیکھیں تو اس میں تنقیدی انداز اختیار کیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کسی نے راوی میں چھپنے کے لیے نظم بھیجی جو قابل اشاعت نہ تھی۔ موصوف وہ نظم شائد اس سے پہلے بھی راوی بکس میں ڈال چکے تھے اس بار وہ راشد کے ہاتھ لگ گئی۔ راشد کے اس پورے اداریے میں اُسی کا تذکرہ دکھائی دیتا ہے:

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کسی "عزیز" نے راوی کے سابقہ اداریے کے نام اپنی نظم بغرض اشاعت بھیجی تھی مگر بقول "آنعزیز" "وہ تو نہ چھپی....." تو آپ نے راوی کے موجودہ اداریے کے زمانے میں حالات کی تبدیلی سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے "چند اشعار بڑی تشویش اور جانکاہی سے موزوں کر کے" اور "اخیر کا شعر اگلی نامنظور نظم سے لے کر" راوی بکس کو اپنی عنایت بے غایات کے زیر بار کر دیا۔ لطف یہ کہ نظم ارسال کرنے والے "عزیز" نے ہمارے دوست "مسٹر ر۔ د۔ اصاحب" کے پردے میں ہم پر یہ کرم کیا ہے۔ حالانکہ اصلی "مسٹر ر۔ د۔ اصاحب" کے متعلق جہاں تک ہمیں علم ہے وہ خود "موضوع شعر" بن سکتے ہیں لیکن شعر گوئی سے اُنہیں کبھی دور کا تعلق بھی نہیں ہو سکتا۔ ہاں صرف کبھی کبھار جب انہیں اپنے متعلق غلط فہمی ہو جاتی ہے تو اپنی مشق ستم کے لیے "راوی" ہی کو انتخاب فرماتے ہیں۔"6

آگے چل کر لکھتے ہیں:

Vol. 3 No.1 2019
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

"اگر اس نظم کے "مستور مصنف" اپنے "حریم ناز" سے نکلنا گوارا نہیں فرمائیں گے تو ہمیں کالج کے محکمہ سراغرسانی سے استدعا کرنا پڑے گی کہ ہمیں اپنے اس "گمشدہ عزیز" کی تلاش میں مدد دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔"7

جون 1931ء کے راوی کے اداریے میں بھی وہی رنگ دکھائی دیتا ہے۔ راشد نے راوی کے اردو حصہ میں "بزم سخن" کے متعلق کچھ لکھ دیا جس کے انچارج قاضی صاحب تھے بات اُن کے کانوں تک بھی چلی گئی اور اُنہوں نے اس کا بُرا منایا۔ اس اداریے میں راشد نہ صرف اُس کی وضاحت کر رہے ہیں بلکہ معافی بھی مانگ رہے ہیں ساتھ ہی ساتھ اُنہوں نے کالج کے تین لوگوں کو آئی سی ایس کے امتحان میں کامیابی پر مبارک باد بھی پیش کی ہے۔ اس کے علاوہ فرسٹ ایئر میں داخل ہونے والے طلباء کے استقبال کے طریقے کو بھی ناپسند فرمایا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُنہوں نے فرسٹ ایئر کی ذہانت کو آزمانے کے لیے اس اداریے میں ایک سوال نامہ بھی شامل کیا ہے:

"چنانچہ ہم ذیل میں چند سوالات درج کرتے ہیں جن سے ہمارا مقصد "فسٹیز" کی ذہانت کا پتہ چلانا ہے۔ ان سوالوں کے صحیح جوابات بھیجنے والے "فسٹیز" کو بذریعہ قرعہ اندازی علی الترتیب (1) ہوائی جہاز کا فوٹو (2) دیا سلائی کی ایک خالی ڈبیا (3) اور سوڈا واٹر کی ایک شکستہ بوتل انعام میں دی جائیں گی۔

(1) اگر سونے کا بھاؤ بیس روپے فی تولہ ہو اور ایک تولے کی چار انگوٹھیاں بن سکتی ہوں تو لارڈ کرزن کس سن میں پیدا ہوا تھا؟ جواب کسور اعشاریہ میں ہو۔ (2) امیر اور کبیر مل کر ایک کام کو تین گھنٹے میں کر سکتے ہیں۔ لیکن وزیر اس کام کو "بمشکل" دو گھنٹوں میں کر سکتا ہے تو بتاؤ کہ خرگوش ایک گھاس کے کھیت کو کتنے دنوں میں چر لیں گے۔

(3) بھیڑوں کے گلے میں اونٹ جا رہا ہو تو اسے کس طرح شناخت کرو گے؟ (سائنٹیفک طریقہ بتانے والے کو ترجیح دی جائے گی۔"8

اکتوبر 1931ء کے اداریے میں بھی راشد نے ظرافت کا انداز ہی اپنایا ہے۔ اس رسالے کو ترتیب اُنہوں نے نہیں دیا تھا اس لیے لکھتے ہیں:

"راوی کا یہ نمرہ ہماری عدم موجودگی میں ترتیب دیا گیا۔ چنانچہ اس اشاعت میں اگر آپ کو کوئی خوبی نظر آ جائے تو ازراہِ نوازش ہمیں "ملزم" نہ گردانئے اور اگر کوئی خامی ہو تو بلاخوف و خطر نیازی صاحب کے سر تھوپ دیجئے۔"9

یہاں وہ لکھتے ہیں کہ کالج کا مجلہ "راوی" جن مقاصد کے لیے نکالا جاتا ہے ایسے مضامین ارسال کریں کہ وہ مقاصد پورے ہو سکیں۔ نومبر 1931ء کے راوی کے اداریے میں اُنہوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ وہ لوگ جن کی کوئی تحریر راوی میں جگہ نہیں پا سکتی وہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ راشد نے جان بوجھ کر اُن کی تحریر کو جگہ نہیں دی یا ایسے لوگ جو کچھ نہیں لکھ سکتے وہ اسسٹنٹ ایڈیٹر بننے کے لیے سفارش کرواتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ وہ بھی طالب علم ہیں اور اُنہیں کسی سے عداوت نہ ہے وہ تو صرف اس رسالے کو باقی کالجوں کے رسالوں سے افضل بنانا چاہتا ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہر مضمون نگار اپنے مضمون کو سب سے اعلیٰ خیال کرتا ہے۔ راشد کی مجبوری یہ تھی کہ اردو حصے میں صرف بارہ صفحات آتے تھے اور موصول ہونے والے مضامین کی تعداد میں سے صرف بہترین کا انتخاب کرنا ہوتا تھا اور یہ یقیناً اُن کے لیے بھی بڑا مشکل مرحلہ ہوتا تھا۔

جنوری 1932ء کے "راوی کے" اداریے میں راشد نے کسی صاحب کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور طنز کے تیر خوب برسائے ہیں لکھتے ہیں کہ پروفیسر بخاری صاحب نے زمانہ طالب علمی میں مضمون لکھا تھا "کتے" جو "ہزار داستان" مرحوم میں چھپا تھا۔ اس پر بہت سارے لوگوں نے حملے کئے جہاں دیگر کالجز کے طلباء نے یہ کام کیا وہاں ہمارے اپنے کالج کے

Vol. 3 No.1 2019
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

طلباء بھی اس کام میں کسی سے پیچھے نہ رہے افضل صاحب (راشد سے پہلے راوی کے ایڈیٹر) کے زمانہ ادارت میں بھی یہ مضمون "مکالمہ" کے عنوان سے ایڈیٹر کی لاعلمی کی وجہ سے چھپ گیا۔ اسی غلطی کو ایک اور طالب علم نے دہرایا اور "صدائے احتجاج" کے نام سے دوبارہ ارسال کر دیا۔ جس پر راشد خاصے برہم نظر آتے ہیں لکھتے ہیں:

> "ہمارے پاس الفاظ نہیں کہ ہم اس طالب علم کی اس بیہودہ جسارت پر حیرت اور افسوس کے اُن کے جذبات کا کماحقہ اظہار کر سکیں جو اس وقت ہمارے دل کو مجروح کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اس طالب علم کا ضمیر زندہ ہوتا تو وہ ضرور اس کی اس غیر شریفانہ حرکت کے خلاف "صدائے احتجاج" بلند کرتا۔ ایسے ہونہار طلباء گورنمنٹ کالج کی روایات کے دامن پر سیاہ دھبہ ہیں۔ اگر یہ طالب علم مضمون کے اصلی اور واجب الاحترام نگارندہ کو اپنی تمام تر شرافت کو بالائے طاق رکھ کر "گالیاں" تک دے لیتے تو غالباً ہمیں یا صاحب موصوف کو اس قدر قلق نہ ہوتا جو ہمیں اُن کی موجودہ کارروائی سے ہوا ہے۔"10

اُنہوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ صاحب موصوف نے یہ مضمون دس سالہ پرانے "ہزار داستان" میں دیکھا ہو گا اور پطرس بخاری صاحب سے ناواقف ہونگے اس لیے یہ حرکت کی۔ وہ بخاری صاحب کو بھی مشورہ دے رہے ہیں کہ جب اتنے لوگ یہ حرکت کر چکے ہیں تو وہ اس کو اپنا مضمون کہنے پر کیوں بضد ہیں۔ اُنہیں چاہیے کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے اسے ادبی یتیموں میں تقسیم کر دیں۔ اُنہوں نے مضمون بھیجنے والے کے پہلے چھپے ہوئے مضمون پر بھی شک کا اظہار کیا ہے کہ شائد وہ بھی کسی کا چرایا گیا ہے۔ آخر میں ایک اطلاع کی صورت میں انہوں نے مارچ میں "اولڈ بوائے" نمبر شائع کرنے کا اعلان کیا ہے جس میں اُن اولڈ راوئینز سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ لوگ جو زمانہ طالب علمی میں "راوی" کے لیے لکھتے رہے وہ اپنی تازہ ترین تحریروں سے نوازیں۔ آخر میں مصارف برداشت کرنے پر "بزم سخن" سوسائٹی کا شکریہ ادا کیا ہے۔

مارچ۔ اپریل 1932ء کا اداریہ جو راشد نے "اولڈ بوائے نمبر" کا لکھا اُس کا آغاز ہی بڑا اچھا ہے لکھتے ہیں:

> "اس وقت جب ہم "راوی" کے "اولڈ بوائز نمبر" کا اداریہ لکھ رہے ہیں۔ ہم بفضل خدا خود بھی نصف کے قریب اولڈ بوائے ہو چکے ہیں۔ اس لیے کہ ایم اے کے امتحان کے بعد ہم نے آج ہی "غسلِ صحت" کیا ہے اور شومئی قسمت دیکھئے کہ آج ہی نسیم صاحب اداریے کے لیے ہمارے سر پر جن کی طرح سوار ہیں۔ خدا رحم فرمائے۔"12

آگے چل کے لکھتے ہیں کہ اولڈ بوائے نمبر کا خیال مسعود صاحب نے دیکھا اور اُس کو عملی جامہ میں نے پہنایا۔ جس سے نہ صرف ہمیں خوشی ہو گی بلکہ پہلے تینوں بزرگوں کی روحیں بھی خوش ہونگی۔

اُنہوں نے مضامین ارسال کرنے والوں کو سراہا۔ اس کے بعد مصارف کا ذکر ملتا ہے کہ کس نے برداشت کیے۔ آخر میں پسندیدگی کی استدعا کر رہے ہیں لکھتے ہیں:

> "ہمیں قطعاً یہ دعوےٰ نہیں کہ ہم نے "اولڈ بوائز نمبر" نکال کر ادب اُردو کی کوئی "معرکتہ الآراء" خدمت سرانجام دی ہے۔ یا وہ بہادری کا کارنامہ دکھلایا ہے جو "سنہری حرفوں" میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ یہ علیٰحدہ بات ہے کہ آیا سنہری حرفوں میں لکھ دینے سے کسی کارنامے کی اصلی حیثیت میں کچھ فرق پڑتا ہے یا نہیں پڑتا۔ یہ ایک سائنٹیفک مسئلہ ہے۔ جو بہت ہی گہرا ہے اور فی الحال آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ بہرحال اس "بدعت" پر صرف یہ خواہش ہے کہ آپ کفر کے فتوے صادر کرنے کی بجائے جائز پسندیدگی کا اظہار فرمائیں۔ کیونکہ ورنیکلر سیکشن کے ایڈیٹروں کے لیے یہی "رول آف آنر" ہے۔"21

Vol. 3 No.1 2019

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

اسی اداریے کا دوسرا حصہ راشد نے "گورنمنٹ کالج میں اردو" کے عنوان کے تحت لکھا اور اس میں راوی اور گورنمنٹ کالج سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی اردو زبان کے لیے خدمات کا ذکر ملتا ہے۔ راشد نے اس ذکر کو سر علامہ اقبال سے شروع کیا ہے اور سر عبد القادر، مرزا محمد سعید اور خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب اور اُن کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے حسن جعفری پر ختم کیا ہے چونکہ یہ راشد کا آخری اداریہ تھا اس لیے وہ اس میں اُن تمام اصحاب کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے اُن کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ راشد جب اپنی تعلیم مکمل کر چکے تو اپنے ادبی ذوق کو پورا کرنے کے لیے اُنہوں نے ایک رسالے "نخلستان" کی اعزازی ادارت قبول کر لی اُس میں لکھے گئے ایک اداریے میں اُنہوں نے غالب اور ذوق کا آپس میں موازنہ پیش کیا ہے۔ یہ موازنہ اُنہوں نے کسی دوست کے کہنے پر کیا ہے اور اسے "نخلستان" میں اداریے کے طور پر شامل کر دیا ہے۔ راشد کہتے ہیں کہ اُن کو اس موضوع میں کوئی دلچسپی ہی نظر نہیں آتی کیوں کہ ان دوناموں کا ساتھ ساتھ لیا جانا بھی مناسب نہیں ہے راشد ذوق کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "کیونکہ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ جس مقصد کے لیے ذوق کو پڑھنا مفید ہے اُسی مقصد کے لیے فرہنگ آصفیہ، کو بھی یاد کر لینا بلاشبہ مضر نہیں۔ اور اگر اقتصادی مصلحت نہ ہو تو دیوانِ ذوق کی بجائے مواخر الذکر کتاب کا خریدنا بہر حال بہتر ہے کیونکہ اس میں اول الذکر کی نسبت الفاظ اور محاورے زیادہ ہیں۔ شاعری ظاہر ہے ان میں سے کسی ایک میں بھی نہیں!13؎

راشد کا خیال ہے کہ اس سے پہلے جن لوگوں نے غالب اور ذوق کا موازنہ پیش کیا ہے اُنہوں نے محض ذوق کا حق شاگردی ادا کرنے کے لیے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نئے حضرات اس موضوع کو لے کر خواہ مخواہ پوسٹ آفس کے ریوینیو میں اضافہ کرتے رہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ایڈیٹر کی قابلیت کا امتحان بھی لیتے ہیں یہ لوگ نہیں جانتے کہ انکشاف کی متواتر تحریک کے تحت ذوق مرحوم کا نام بھی ادب اردو کی تاریخ میں باقی نہیں رہ سکے گا۔ غالب کا ہم عصر ہونے کی وجہ سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ذوق بھی غالب کے پائے کا شاعر ہے۔ ذوق پر آج تک جتنی تنقیدیں لکھی گئی ہیں اُن میں اس بات پر زور نظر آتا ہے کہ ذوق نے زبان کی خدمت کی ہے۔ اُس کو اجنبی اور ناموس محاورات اور تراکیب جمع کرنے کا مجنونانہ حد تک شوق تھا یہ زبان کی کچھ ایسی خدمت نہیں ہے زبان کی خدمت کا مطلب ہے کہ الفاظ میں اس قدر قوت پیدا کر دی جائے کہ وہ مفروضہ لغات اور علم قواعد کی بندھنیں توڑ کر ادیب کے خیالات کے لیے خود بخود راستہ بناتے چلے جائیں۔

راشد کے نزدیک ذوق کی شاعری اچھے خیالات سے خالی ہے۔ وہ شعر کہتے ہوئے اس خیال کو اپنے دماغ میں موجود پاتا ہے کہ وہ دربار شاہی میں موجود ہے اور اُستاد کی حیثیت سے گرائمر اور عروض کی غلطیاں نکال رہا ہے۔ جہاں غالب کا ہر مصرع شعریت اور تخیل سے لبریز ہوتا ہے، وہاں ذوق کی شاعری میں تخیل فرضی طور پر ٹھونسا ہوا پایا جاتا ہے۔:

> "غالب کو پڑھنے کے لیے آپ کو اُس کے خیالات کا سمجھنا یا کم از کم اُن سے واقف ہونا ضروری ہے لیکن ذوق کا مطالعہ ان حالات میں بھی ہو سکتا ہے کہ آپ لغت کا استعمال جانتے ہوں۔ غالب کا ایک نقطہ نگاہ ہے۔ لیکن ذوق طبعی خود فکری جدت اور ذہن کی بلندی سے محروم ہونے کی وجہ سے کوئی نقطہ نگاہ نہیں رکھتا۔ وہ ایک نصب العین کا مالک ضرور ہے جو واضح کیا جا چکا ہے۔ ایک فوری قریب الحصول اور پست نصب العین! اُس کا تصوف اور اخلاق سب اُس کی خود فریبی ہے۔"14؎

Vol. 3 No.1 2019
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

آخر میں راشد داغ اور ذوق کا موازنہ کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اُن کے موازنے میں ذوق کی شاعری داغ کے مقابلے میں بھی پھیکی پڑ جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں بعض اصحاب کہتے ہیں کہ داغ کی شاعری میں عریانی ہے تو شاعری میں عریانی کو گوارہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ اُس کا تعلق بھی جذبات سے ہوتا ہے لیکن ذوق کی شاعری میں عریانی بھی نہیں ہے بلکہ قطعی طور پر غلیظ ہے اور ادبیات میں غلاظت کا کوئی جواز نہیں ہے:

> "برعکس شعر میں نام نہاد اخلاقیات اور تصوف کے علمبردار داغ کی شاعری کو عریاں کہہ کر اکثر قابل مذمت قرار دینے میں کوتاہی نہیں کرتے ہیں۔ افسوس ذوق کی شاعری کو عریاں بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ وہ تو قطعی طور پر غلیظ ہے۔ عریانی ادبیات میں بہر حال گوارا کی جا سکتی ہے کیونکہ ان کا تعلق جذبات سے ہے ان ہی کے ہیجان میں مضمر ہے، اور آنحالیکہ شاعری خود جذبات پر قائم ہے۔ لیکن غلاظت کا ادبیات میں کوئی جواز نہیں۔"15

"نخلستان" کو چھوڑ کر راشد تاجور نجیب آبادی کے رسالے "شاہکار" میں شامل ہو گئے اور "اپریل 1935ء کے پہلے شمارے کا اداریہ لکھا جو کافی طویل ہے اس اداریے میں راشد نے پہلے تو اُردو کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو لوگ مغربی علوم سیکھ چکے ہیں اُنہوں نے اپنی زبان سے منہ موڑ لیا ہے یہی وجہ ہے کہ اردو زبان پر جمود چھایا ہوا ہے اور مدرسوں اور جامعات کے طلبہ بھی اس سے اس قدر بے بہرہ ہیں کہ اُن سے بھی کوئی امید رکھنا بے کار ہو گا۔ اردو زبان سے بے نیازی کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ کسی شخص میں موجود صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں زبان ہی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ آگے چل کے زبان کی اہمیت بارے لکھتے ہیں:

> "ہماری بڑھتی ہوئی جہالت کے چند اسباب ہیں جن کے اصلی سرچشموں سے ہم ناآشنا ہیں۔ ان اسباب میں سے جسے سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے یہ ہے کہ اردو یعنی ہماری زبان کو ذریعہ تعلیم و تدریس نہیں بنایا گیا۔ جس کا نتیجہ براہ راست یہ ہے کہ ہم اپنی زبان کی صلاحیت اور اس کی علمی حیثیت سے ناواقف ہو گئے ہیں۔ حالانکہ کسی قوم کے افراد میں اجتماعی خودی کا احساس اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا۔ جب تک کہ اُن کی اپنی زبان جس کے پس پشت اُن کی ذاتی روایات ہوں۔ ان کے خیالات کا معین اور لازمی ذریعہ اظہار نہ بن جائے، اور اس احساس کے بغیر کسے علم نہیں، کہ کسی قوم کی زندگی میں ثبات و قیام کا امکان نہیں ہے۔"16

آگے لکھتے ہیں کہ خارجی زبان سیکھ لینا مشکل کام نہیں ہے لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ اُس زبان میں اپنے خیالات کا اظہار بڑا مشکل کام ہے۔ انگریزی کے لیے ہم ساری زندگی اس کو سیکھنے میں لگاتے ہیں لیکن پھر بھی ہم اس قابل نہیں ہوتے کہ پوری قوت سے اپنے خیالات کا اظہار اس زبان میں کر سکیں اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ خیالات پر ہماری گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور آخر کار خیالات کے یہ قدرتی سرچشمے ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔ ہماری قوت اظہار ختم ہو جاتی ہے اور اس بات کا بھی امکان ہوتا ہے کہ ہمارا کلچر بھی تباہ ہو جائے۔

ہم اس سے براہ راست نجات حاصل نہیں کر سکتے لیکن اس کے اثرات کو کافی حد تک کم ضرور کر سکتے ہیں مولانا تاجور نے اس کے لیے دو اقدام اُٹھائے ہیں ایک "اردو مرکز" جس میں وہ قدیم اور جدید نگارشات جو مستقل ادبی حیثیت رکھتی ہیں جمع کرنے کا پروگرام ہے دوسرا رسالہ "شاہکار" کا اجراء ہے جو بذات خود ایک ادبی خدمت ہے۔ آگے چل کے راشد نے "شاہکار" کی زبان اور اسلوب کے بارے میں بات کی ہے اور رسالے کی پالیسی کے بارے میں آگاہ کیا ہے:

Vol. 3 No.1 2019
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

"مزید برآں اس بات کا فیصلہ کیا گیا ہے کہ "شاہکار" میں نہ تو اس قدر خشک مضامین کی اشاعت کی جائے گی جن کا مطالعہ عام قارئین کے لیے صبر آزما بن جائے نہ اسے رنگین نگارشات کا ایسا نگار خانہ بنایا جائے گا۔ جسے دیکھنے سے ثقہ نگاہوں میں تلخی پیدا ہونے کا احتمال ہو۔"17؎

آگے راشد نے ادب اور تنقید کے معیار کو بلند کرنے کی بات کی ہے کہ وہ اس رسالے کے ذریعے ادبیات کے مقام کو بلند کریں گے۔ رسالے میں صرف اُنہیں نظموں کو جگہ دی جائے گی جو فکر پر مبنی ہونگی۔ تصاویر بھی صرف وہ شائع کی جائیں گی جو خالص مشرقی فن کا احیا اور ترویج کریں راشد نے لکھنے والوں اور عام لوگوں سے یہ بھی گزارش کی ہے کہ اگر آپ "شاہکار" پر تنقید کرنے کا ارادہ کریں براہِ مہربانی مثبت تنقید کریں تاکہ آپ بھی اردو ادب کی اس خدمت میں شامل ہو سکیں۔ آخر میں رسالے کی اشاعت اور پھر چند مضامین شائع نہ ہونے پر اگلے شمارے میں اس کی تلافی کا وعدہ بھی کیا ہے اور اس دعا کے ساتھ ختم کیا:

"خدا ہمارے اہل ملک کو اپنی زبان، اپنے ادب اور اپنے علوم و فنون کی اور زیادہ محبت دے اور ہمارے حوصلوں میں اس قدر توانائی دے کہ ہم اس مجلہ کے ذریعے صحیح معنوں میں اردو ادب کے شاہکار پیش کر سکیں۔"18؎

دوسرے اداریے میں راشد نے ہماری تنقید میں رائج اقسام پر تنقید کی ہے کہ ہمارے ہاں علم تنقید کی بنیاد ایسے کلیے پر نہیں ہے جس سے ہمیں شعر کہنا، افسانے اور ڈرامے لکھنا یا ادبی نگارشات کی ہیت و ساخت کو اصول کے تحت معین کرنا آجائے۔ تنقید کی ایک خاص شکل سامنے آنے کی وجہ سے لوگوں میں نئے نئے تجربے کرنے اور اپنے خیالات کو شعروں میں ڈھالنے کی ہمت نہیں رہی اور یوں ادب جمود کا شکار ہو گیا نئے تجربات کے بارے لکھتے ہیں:

"یہ تجربات ایسی ہواؤں کے مانند ہیں جو دفعتہً آتی ہیں اور تمام خس و خاشاک کو اُڑا کر لے جاتی ہیں۔ فضا نئے سرے سے پاک و صاف ہو جاتی ہے۔ اس شوق مسابقت نے اُن ہواؤں کے چلنے کے امکانات کو ختم کر دیا۔ حتیٰ کہ حالیؔ نے دفعتہً انقلاب کی ضرورت محسوس کی۔"19؎

تنقید پہلے سے موجود نہیں ہوتی بلکہ یہ بات ایسی ہی ہے جیسے ہم کوئی دلکش یا نفرت انگیز چیز دیکھتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ چند الفاظ صرف کر کے ستائش یا مزمت کے جذبے کا اظہار کریں۔ ایک نقاد ادب پر اسی طرح غور و فکر کرتا ہے جیسے ایک فلسفی زندگی کے مظاہرات پر۔ آگے لکھتے ہیں کہ نقاد کے لیے ضروری نہیں کہ وہ خود بھی شاعر یا افسانہ نگار ہو۔ شاعری کا نقاد جس حد تک کم شاعر ہو شائد وہ اُسی حد تک بہتر نقاد ہو سکتا ہے۔ کیونکہ شاعر حسن کو غیر شعوری طور پر محسوس کرتا ہے لیکن نقاد کو شعری احساس ہونا چاہیے نقاد کو اس بات کا بھی خیال ہونا چاہیے کہ فن کا مقصد یا نصب العین زندگی کا احاطہ کرنا ہے، ساری کی ساری زندگی پر۔ اور وہی فن کار عظمت کا حقدار ہے جو اپنی زندگی سے آگے بڑھ کر متواتر زندگی اور کائنات کا احاطہ کرتا چلا جائے۔

نقاد کو یہ بھی نہیں کرنا چاہیے کہ وہ کتاب کو دیکھے یا پڑھے بغیر اُس کے بارے میں رائے قائم کرے۔ بلکہ اُسے کتاب کے لکھے جانے کی وجہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی دیکھنا ہو گا کہ یہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر کیا اثرات مرتب کرے گی۔ اور مصنف نے کیا سوچ کر اس کتاب کو تخلیق کیا ہے:

"ادیب کے نفسی مطالعہ کے بغیر تنقید مکمل نہیں ہوتی چنانچہ نقاد وہی کامیاب ہے جو ادبی کاوشوں کا انشا پرداز کے ذہن سے تعلق نمایاں کرے۔ محض اصلاحی اور تحریبی کوششوں سے ادبی تنقید وجود میں نہیں آتی۔ اس کے لیے ادیب کے دل کی گہرائیوں میں اترنے کی ضرورت ہے۔" 20؎

Vol. 3 No. 1 2019
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

جون 1931ء کے "شاہکار" کا اداریہ راشد نے "اسلوب بیان" کے عنوان سے لکھا جس میں راشد نے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتے ہوئے درست اسلوبِ بیان کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ عہد تاتار اور عہد مغول سے شروع کرتے ہیں۔ جن کی نظر میں اسلوب بیان کا مطلب وہ ہے جن کی رو سے کوئی ادیب اپنے خیالات کو بہترین انداز سے ترتیب دے سکتا ہے۔ اس مفہوم کو ایک عرصے تک اہمیت حاصل رہی اور فصاحت و بلاغت اور عروض پر بے شمار کتب لکھی گئیں اور آنے والوں نے یہ فرض کر لیا کہ ان میں بتائے گئے اصولوں کی پیروی کیے بغیر اچھا ادب تخلیق کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن دراصل سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ انداز اگر جان بوجھ کر اختیار کیا گیا تو صرف مصنوعی ادب رائج ہو سکتا ہے کیونکہ جن ادبا کی تحریروں میں عظمت اور پائندگی پائی جاتی ہے وہ قدرتی طور پر اپنے خیالات کے اظہار پر قادر ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تکنیک کی سمجھ اُس ادیب کے لیے بھی مفید ہوتی ہے جس کا ذہن قدرتاً خلاق ہوتا ہے۔ دوسری طرف مزین اور وضع فقرے بھی اسلوبِ بیان سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ اس کی مثال بیرونی پوشش کی سی ہے۔ اس کی مثال کے طور پر راشد نے "تاریخ وصاف" اور "سہ نثر ظہوری" پیش کی ہیں۔

اسلوب بیان کا ایک دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ایک ادیب کا وہ انداز تحریر جس کی وجہ سے وہ دوسرے ادیبوں میں ممتاز ہو جائے یا نمایاں مقام حاصل کر سکے۔ راشد کے خیال میں یہ دونوں مفہوم اسلوب بیان کی درست تعریف پر پورے نہیں اُترتے کیونکہ جہاں پہلا مفہوم غلط ہے وہاں دوسرا فریب آمیز ہے کیونکہ ایسی انفرادیت ارادۃً بھی اختیار کی جا سکتی ہے۔ جہاں فصاحت و بلاغت بیرونی پوشش کی حیثیت رکھتی ہیں وہاں انفرادیت رفتار و گفتار سے زیادہ حیثیت کی حامل نہیں ہیں۔ جب کوئی ادیب اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لیے ایک خاص انداز اختیار کرتا ہے تو وہ اسلوب بیان کا مالک نہیں ہو سکتا۔ جب زندگی کسی ادیب کے اندر جذبات پیدا کرنے سے بے بس ہو جائے اور کوئی ادیب زندگی سے فائدہ اُٹھانے کی بجائے الفاظ سے اُٹھانے لگے۔ جان بوجھ کر استعارات کی نمائش کرنے لگے اور اپنی تحریر پر دل سے فریفتہ ہو جائے تو اُس کے لیے جذبات میں کوئی دلکشی باقی نہیں رہتی۔ اسلوب کا انحصار خصوصی رجحانات پر ہوتا ہے۔ جب ادیب زبان کو اپنے اوپر طاری کرنے کی بجائے خود زبان پر حاوی ہو جائے جس کی مثال ہمارا بڑے سے بڑا شاعر ہے۔

اسلوب بیان ایک ہلتا جلتا، نشوونما پاتا جسم ہے۔ یہ نہ تو پوشاک کی مانند ہے نہ رفتار و گفتار بلکہ گوشت پوست کا جسم ہے جس کے اندر ادیب کے ادراکات، احساسات اور خیالات دھڑکتے ہیں۔ راشد نے نثر کو جانچنے کے پرانے طریقوں پر تنقید کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ ادب کو زوال کی طرف لے کر جا رہے ہیں۔ ہمیں وقتی معنی کی ضرورت ہوتی ہے ناں کہ لمبی چوڑی تصویر کشی کی اور جو ایسا کرتا ہے وہ ادب میں کبھی بھی عظمت اور پائندگی حاصل نہیں کر سکتا۔ اسلوب بیان میں باقی چیزوں کی نسبت صحت الفاظ زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ مطلب جذبات کو محسوس کرنے کی صحت جو الفاظ میں ظاہر ہوتی ہے۔ راشد کا کہنا ہے کہ بلاغت کے چکر میں آ کر ہم بیان کو صحت اور خلوص سے عاری کر دیتے ہیں جبکہ جذبے کا ہمارے موضوع کے ساتھ مکمل رابطہ ہونا بے حد ضروری ہے۔ ایک ادیب کو یہ سب سکھایا نہیں جا سکتا یعنی اپنی انفرادیت کو قائم رکھنا خواہ وہ کتنی بھی پست درجہ کی کیوں نہ ہو۔ اگر کوئی ادیب محسوس کرتا ہے اور سوچتا ہے اور پھر یہ جان لیتا ہے کہ وہ کیا محسوس کرتا ہے اور کیا سوچتا ہے اور اپنے احساسات کے اظہار میں خلوص سے کام لیتا ہے تو وہ اُس خود فریبی سے بچ سکتا ہے جو مصنوعی ادب کی پیدائش کا باعث ہے:

> "ہم بالآخر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اسلوب بیان زبان کی اُس خصوصیت کا نام ہے جو پوری صحت سے اور کامل طور پر ہمارے جذبات اور خیالات کو آشکار کرے۔ یہ جذبات اور خیالات کے ایسے نظام کا نام بھی ہے جو ہر مصنف کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ جب خیالات کا غلبہ ہو جائے تو قوت اظہار نثر کی صورت میں ہوتی ہے اور جب جذبات غالب آ جائیں تو اظہار کبھی نثر میں ہوتا ہے اور کبھی نظم میں ہوتا ہے اور کبھی نظم میں۔ لیکن جب کسی جذبے کا براہ راست تعلق ادیب کے شخصی تاثرات سے ہو اور اس جذبے

Vol. 3 No.1 2019
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

میں غیر معمولی شدت ہو تو اظہار کا زیادہ میلان نظم کی طرف ہوتا ہے۔ اسلوب بیان اُس وقت مکمل ہوتا ہے جب خیالات اور جذبات کما حقہ ظاہر ہوں۔ لیکن اس کی عظمت کا دارومدار اس بات پر ہے کہ لکھنے والے کے جذبات اور خیالات کا نظام اعلیٰ اور ارفع ہو۔ کیونکہ اگر کسی ادیب کی دلکش سے دلکش اندازِ تحریر بھی حاصل ہے اور وہ انداز تحریر ذہن کی بلندی پر مبنی نہیں تو وہ محض بے کار شے ہے۔ اسے ادبیات میں کبھی پائندگی نصیب نہیں ہو سکتی۔" 21؎

ایک اصلی اسلوب بیان ناممکن ہے کیونکہ کوشش سے کسی دوسرے کی نقل کی جاسکتی ہے اور یہ خود فریبی کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

جولائی 1935ء کے "شاہکار" کا اداریہ "ادبیات میں اجتہاد" کے عنوان سے لکھا ہے راشد نے لکھا کہ دنیا بھر کے ادب پر نظر ڈالنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر قوم کے ذہنی رجحانات دوسری قوم سے مختلف ہوتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی قوم میں مختلف وقتوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ وقت کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ فرق آتا رہتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ قوم اپنے ادیبوں سے بھی مختلف قسم کی نگارشات کی توقع کرتی ہے۔ اسی طرح ادبی تغیرات نمودار ہوتے ہیں۔ جو قوم ان تغیرات سے محروم ہو اُس کا ادب بھی نشوونما سے محروم ہو جاتا ہے اور فرسودہ اور باطل قرار پاتا ہے۔ ایشیا میں ایسے تغیرات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کی وجہ ہمارے جغرافیائی حالات اور کسی حد تک مذہب ہے۔ مذہب نے ہمیں ایک نقطے پر لا کھڑا کیا ہے اور ہم خارجی اثرات کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اس طرح ہمارے اندر کی خود فکری ختم ہو گئی اور ہم اپنے ہی آباؤ اجداد کی پیروی کرنے پر مجبور ہیں، اور ہماری اپنی کوئی حیثیت نہیں۔ مغرب نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا ہے کیونکہ ان کے فکر و عمل پر حکومت یا کسی اور طاقت کو غلبہ نہیں رہا۔

ہماری شاعری میں بھی مذہب کے خلاف تھوڑی سی بغاوت نظر آتی ہے اُس نے بھی تمثیلات اور تصورات کا ایک ایسا ڈھانچہ تیار کر لیا ہے جس کے سامنے ہر شاعر سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہے لیکن اُس نے ادب میں کوئی انقلاب برپا نہیں کیا۔ مثال کے طور پر "شمع و پروانہ" اور "گل و بلبل" جیسی تمثیلات اس قدر عام ہیں کہ شاعر ان سے بچ نہیں سکتا۔ دوسری طرف شیخ سعدی کی "گلستان سعدی" جیسی کتابوں کو ہم نے عظیم تر خیال کیا اور یہ سمجھا کہ اس سے بہتر لکھا جانا ممکن نہیں ہے:

"اردو میں سب سے پہلے جس شخص نے طرز خیال میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی وہ حالیؔ ہے۔ رسوم و قیود کا سب سے پہلا باغی وہی ہے۔ اُس نے شعری تمثیلات میں اور تصورات میں یقیناً اجتہاد کیا۔ حالی نے بہت بڑا کام کیا ہوتا اگر اُس نے قدیم تمثیلات اور تصورات کو اولاً تباہ کرنے کی کوشش کی ہوتی۔ جنہوں نے ہماری شاعری کو یخ بستہ کر دیا ہے۔ یا قدیم اصناف سخن و مروجہ بحور و قوافی میں اتنی آزادی اور ترمیم قبول کر لی ہوتی کہ نئے خیالات کے اظہار کے لئے نئے شعراء کو نئی شاہراہیں مل جاتیں۔" 22؎

اس بات سے انکار نہیں ہے کہ غزل اظہار کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس پر ہم سب نازاں ہو سکتے ہیں۔ اس میں خیالات کے قبول اور اظہار کی پوری آزادی ہے لیکن ایک عرصے سے یہ واحد ذریعہ اظہار ہے جو اپنی بنیادی صلاحیتوں سے محروم ہو چکی ہے۔ اگر اس میں نیا پن لانے کی کوشش کی جائے تو ممکن نہیں ہے اس کے وجہ غزل کے شعراء کی افراط ہے۔ جو تمثیلات کو اُن کے لوازم کے ساتھ استعمال کرنا جانتا ہے اُسے شاعر کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اسی لیے ہمارے شاعر اپنے اجداد کے وضع کردہ دائرے میں چکر کاٹ رہے ہیں۔

حالیؔ کی تحریک کے نتیجہ میں شاعری کا معیار اور پست ہو گیا اس کا ازالہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ اس میں لچک پیدا کر کے عشقیہ خیالات اور فرسودہ تمثیلات سے بچایا جاتا۔ اسی طرح شاعری کو فنی طور پر جامد ہونے سے بچایا جا سکتا تھا۔ ادبیات میں نئے اصناف سخن رائج کرنا یا اپنے قدما کے اصولوں سے انحراف کرنا قابل فخر بات نہیں ہے بلکہ قابل فخر بات خیالات و افکار میں اجتہاد ہے۔ نئی تحریکات عام طور پر نوجوان شروع کرتے ہیں جو جمود اور تکرار سے اُکتائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسے نوجوان

Vol. 3 No. 1 2019
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

جدت اور ندرت کی تلاش میں رہتے ہیں اور اُن کا ذوق ہر سال بدلتا رہتا ہے۔ جبکہ عوام کا ذوق بدلنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔ عام طور پر جب کوئی نوجوان بغاوت کرتا ہے تو عوام اُسے پسند نہیں کرتے لیکن آہستہ آہستہ اُسے پسند کرنے لگتے ہیں۔ ادبی تحریکیں یا بغاوتیں عام طور پر اس لیے رونما ہوتی ہیں کہ ادب میں نئی شاہراہیں کھولی جا سکیں۔ اگر ان کا کوئی عملی فائدہ نہیں تو یہ بدعت کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ اگر کوئی نو پسند ہیت شعری میں نئے تجربات کرتا ہے اور اُس میں وہ تخلیقی جوہر اور قوت نہیں جس کے ذریعے وہ نئے تصورات قائم کر سکتا ہے۔ یا پھر اُس کی تحریروں سے اُس کی والہانہ محبت کا ثبوت نہیں ملتا جو اعلیٰ درجے کے خلاق کے لیے ضروری ہے تو وہ ادیب نہیں ادبی شعبدہ باز ہے۔ اس طرح اُس نو پسند نے اپنے جذبات کی تسکین تو کر لی لیکن ادب کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا کیونکہ آنے والے ادیب اس کو معیار خیال کر کے بہک سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ اجتہاد کے لئے قدیم شعری ہیات تجزیب ہی کافی نہیں بلکہ اس میں سے تعمیری ادب کو نمودار ہونا چاہیے۔ اس کا جواز صرف وہ افکار و خیالات ہی پیش کر سکتے ہیں جس کی خاطر ادیب نے نئے راستے اختیار کیے۔ یہی وہ پابندی ہے جس سے ادبی بے اصولیوں میں کمی ہو سکتی ہے اور ادبی اجتہاد ناسور بننے سے بچ سکتا ہے۔ اس سے ان تہذیبی اثرات کی بھی تلافی ہوتی ہے جو کوئی نیا ادیب مقررہ نظام کے خلاف عمل میں لاتا ہے۔

ماہنامہ "شاہکار" کے اگست ۱۹۵۳ء کے شمارے کا اداریہ "ادبیات میں ابتذال" کے عنوان کے تحت لکھا۔ جس کا پہلا جملہ "ادبیات میں علم کا مفہوم وہ جذباتی تجربات ہیں جو ادیب زندگی سے حاصل کرتا ہے" اگر ان جذبات کو ایک طرف رکھ کر صرف اپنی علمیت کی بنا پر لوگوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ ابتذال ہے۔ بہترین ادب اُسی وقت تخلیق پا سکتا ہے جب جذباتی تجربات اور علمیت میں توازن ہو۔ اگر ہم کسی ادبی تخلیق کو متبذل قرار دیتے ہیں تو وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ایک مدت ادب کا مطالعہ کر لینے کے بعد ہم ادب کا ایک معیار قائم کر لیتے ہیں اور اُس سے کم درجہ کے ادب کو متبذل قرار دیتے ہیں۔

کچھ لوگ ایسی باتیں کہتے ہیں جو عوام میں سالہا مقبول رہتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام میں بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو جذبات اور علمیت میں توازن کی سمجھ بوجھ رکھتے ہوں ورنہ جو ادیب فصیح و بلیغ انداز میں عامیانہ خیالات کا اظہار کر سکتا ہے وہ عوام میں سب سے زیادہ مقبول ہے اور عوام اُس کی پرستش کرتے ہیں۔ آگے چل کر راشد نے ابتذال اور عریانی میں فرق کو واضح کیا ہے کہ عریانی کا براہ راست ادب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اخلاقیات سے ہے۔ اگر ادیب نے اپنے تصورات میں خلوص سے کام لیا ہے تو ادب میں عریانیت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ادیب کے ذہن میں جو بھی آئے لکھتا چلا جائے۔ ادبیات میں عریانیت صرف اُسی صورت میں قابل جواز ہے جب فن اُس کا جواز پیدا کرے اگر ایسا نہیں ہے تو تحریروں میں ابتذال پیدا ہونے لگتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ابتذال صرف عریانیت سے پیدا ہوتا ہے بلکہ اس کے بغیر بھی ہو سکتا ہے جیسے کوئی ادبی اہلیت اور تخلیقی قوت کے بغیر ارادی طور پر اپنے جذبات کی نمائش کرنے لگے یا پھر نثر میں مصوری اور نظم میں ایسی موسیقی پیدا کرنے کی کوشش کرے جو عوام کو خیالات، جذبات اور احساسات سے محروم کر دے۔ اس کی مثال اُنہوں نے پنجاب کے ایک شاعر کو بنایا ہے جس کی شاعری عوام میں بے حد مقبول ہے اور اُن لوگوں میں مقبول ہے جن کے اپنے اذہان کی سطح شاعر سے زیادہ بلند نہ ہے۔ ہمارے ہاں شاعری کا معیار یہ خیال کیا جاتا ہے کہ گائی جا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ شاعری موسیقی پر مبنی ہے لیکن یہ معیار نہیں ہے۔ اگر موسیقی اور شاعر کے تخیلات میں ہم آہنگی نہ ہو تو موسیقی شاعر کے کمزور خیالات پر حاوی ہو جاتی ہے۔ جذبات کا پیدا ہونا غلط نہیں ہے کیونکہ ادبیات کا تعلق ہی جذبات سے ہے لیکن اگر اظہار کا طریقہ غلط ہو تو جذبات بھی ابتذال کا شکار ہو سکتے ہیں۔ عوام میں ایسا ادب پسند کیا جاتا جس میں بے پناہ جذبات ہوں چاہے فہم و ادراک نہ ہو کیونکہ یہ چیز اُن کے اذہان سے بالا ہے۔ لیکن بہترین ادب کے لیے "جنون" اور "خرد" میں توازن ضروری ہے:

> "اکثر لوگ بہت تھوڑے عمل کے باوجود بہت تھوڑی مدت میں انتہا درجے کی شہرت اور مقبولیت پیدا کر لیتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ادبیات میں جذبات کا مظاہرہ خواہ یہ جنسی خواہشات اور جسمانی لذت انگیزی کی صورت میں نمودار ہو یا نہ ہو علمیت کی نمائش خواہ فلسفہ اور سائنس کے علم کی کیوں نہ ہو عوام کو پسند ہے۔ کیونکہ وہ انہیں مبہوت و مرعوب کرتی ہے۔ جب جذبات کا مظاہرہ ہو تو خرد پس پشت جا پڑتی ہے، اور خرد کی نمائش ہو تو جذبات اپنی ادبی قدر سے محروم ہو جاتے

Vol. 3 No. 1 2019
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

ہیں۔ ادبیات میں محض بے روح تصویر کشی ہی مبتذل نہیں بلکہ علمیت فروشی کی ترغیب کو نہ روک سکنے کا نام بھی ابتذال ہے۔"23؎

ڈاکٹر بجنوری کی "محاسنِ کلامِ غالب" کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ ابتذال اس کا نام نہیں ہے کہ عوام پسند کلمات کہے جائیں بلکہ بے جا خود آرائی اور نمائش بھی ابتذال ہی ہے۔ ڈاکٹر بجنوری نے بے جا طور پر خود نمائی اور آرائش کا اہتمام کیا ہے۔ اس کا پہلا جملہ ہی اس کی دلیل ہے اور یہ ادبی نقاد کا نہیں بلکہ خالص اشتہار باز کا کام ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء کے "شاہکار" کا اداریہ راشد نے "تکنیک" کی آزادی اور اس کا مفہوم" کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس میں راشد نے بحث کی ہے کہ شاعری کے لیے بحور و قوافی کا ہونا ضروری ہے یا نہیں ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو بحور و قوافی کو راستے کی رکاوٹ خیال کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس کو بہترین ادبی تخلیق کا معاون

قرار دیتے ہیں۔

راشد کا کہنا ہے کہ ہر ملک میں بحور و قوافی اس لیے مختلف ہوتے ہیں کہ وہ موسیقی سے اکتساب کرتے ہیں اور ہر ملک کی موسیقی مختلف ہوتی ہے۔ راشد کے خیال میں بحور و قوافی کی پابندی شاعری میں ترنم و تناسب پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتی اور اگر شاعر کے اندر جذبات کا وفور خیالات کی بلندی اور احساسات کی شدت ہے تو وہ خود بخود ایسی زبان پیدا کرے گا جس میں ترنم اور تناسب ہو:

> "قدیم تکنیک کا ادنیٰ باغی ہونے کے باوجود راقم الحروف کے نزدیک یہ اعتراض قابل پذیر آرائی نہیں کہ بحور و قوافی کی پابندی شاعر کی راہ میں روک اور مزاحمت پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ بحور و قوافی صرف اُس ترنم اور تناسب کے ممد و معاون ہیں جو اعلیٰ شاعر کی روح میں موجود ہوتا ہے۔ جس شاعر کے اندر جذبات کا وفود خیالات کی بلندی اور احساسات کی شدت ہے۔ وہ خود بخود ایسی زبان پیدا کرے گا جس میں ترنم اور تناسب ہو۔ بحور و قوافی کی پابندی بلاشبہ اس قدرتی ترنم کے مدو جزر میں اعتدال پیدا کرتی ہے لیکن اچھے شاعر کے لیے مزاحمت پیدا کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ قوافی اور بحور کی واحد اہمیت ہی اس بات سے ہے کہ یہ اظہار خیال کی بے راہ روی کے لیے رنجیر پا ہیں۔ شاعر کے لیے مناسب ترنم ناگزیر ہے، اور بحور و قوافی کی تکنیک پر غور کرتے ہوئے ہمیں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ ان کی پیدا کی ہوئی پابندی اس قدر شدید تو نہیں کہ قوت اظہار کے لیے بالکل ناپید ہو جانے کا احتمال ہو۔"24؎

راشد کہیں بحر و قافیہ کو شاعر کے رستے کی رکاوٹ قرار دیتے ہیں اور کہیں حمایت کرتے دکھائی دیتے ہیں:

> "اردو میں قافیے کے صحیح ادراک کی مثال میں مولانا ظفر علی خاں کا نام پیش کیا جا سکتا ہے اُن کے فن کا کمال اسی میں ہے۔ قافیہ اُن کی اکثر نظموں کے خیالات کا رہبر ہے۔ قافیے کے صوتی حسن کا سب سے زیادہ احساس مولانا حسرت موہانی کو ہے۔ جن کی شاعری میں ترنم اور آہنگ کا راز قوافی ہیں۔"25؎

آگے جا کر لکھتے ہیں کہ قافیہ کی مدد سے نظم ایک مربوط اور مضبوط ڈھانچے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی سے نظم میں قومی تنظیم اور شکست ناپذیر استحکام پیدا ہوتا ہے۔ راشد نے یہاں قافیہ کو فن حسن کی معراج قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کے بغیر اشعار میں استحکام اور پختگی پیدا کرنا دشوار ہے۔

Vol. 3 No. 1 2019
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

اصناف سخن کے بارے میں بحث کا خاتمہ اس صورت میں ہو چکا ہے کہ قدامت پرستوں نے بھی جدید انکشافات کو اس صورت میں تسلیم کیا ہے کہ قدیم اصناف سخن کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ قدیم اصناف سخن مثلاً اردو اور فارسی میں غزل اور رباعی بعض اوقات ایسے خیالات و افکار کے اظہار پر مجبور کر دیتے ہیں جو گزشتہ نسلوں کی بازگشت ہوں۔ اس مجبوری کا پیدا ہونا نہ صرف تصنع ہے بلکہ شاعر کی اپنی ندرت کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔ کسی شاعر کو نئے اصناف سخن قبول کرنے کی ضرورت اُس وقت ہوتی ہے جب اُس میں قدیم ہئیات شعری سے آزاد ہو کر بہتر ترنم اور جمالی تاثر پیدا کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔ اگر وہ ایسا کر سکتا ہے تو یہ کوششیں نظر انداز کی جا سکتی ہیں۔

ن م راشد نے ہمیشہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے اہم کردار ادا کیا ہے۔ شاعری ہو یا نثر وہ چاہتے تھے کہ اُن میں کچھ نیا کام کیا جائے۔ اسی لیے جب راشد کا وقت آیا تو اُنہوں نے پرانی طرز کے ادب کو فرسودہ قرار دے دیا اور اس بات کی اہمیت پر زور دیا کہ ادب میں جدت کی ضرورت ہے۔ ایسے ادب کی ضرورت ہے جو نئے زمانے میں نئے وقت کے معانی اور مفاہیم کے ادائے مطالب کو پورا کر سکے اس پر نہ صرف راشد نے خود تجربات کیے بلکہ اپنے مضامین کے ذریعے دوسروں کو بھی ایسے ہی تجربات کرنے کی ترغیب دی۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ادب جمود کا شکار ہو جائے گا۔ اگر ادب کو جمود سے بچانا ہے تو تبدیلی بے حد ضروری ہے

حوالہ جات

(1) راحت سہیل، اردو اداریہ کا ارتقاء، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1987ء، ص نمبر: 13

(2) ایضاً ص نمبر: 14

(3) ایضاً ص نمبر: 15

(4) ایضاً ص نمبر: 16

(5) سعادت سعید، ڈاکٹر، محمد رفیق، (مرتبین)، راشد راوی میں، لاہور: جی سی یونیورسٹی، 2010ء، ص نمبر: 8

(6) راوی، لاہور: جلد 25، نمبر 4، فروری 1931ء، ص نمبر: 1

(7) ایضاً

(8) راوی، لاہور: گورنمنٹ کالج، جلد 25، نمبر 8، جون 1931ء، ص نمبر: 2

(9) راوی، لاہور: گورنمنٹ کالج، جلد 26، نمبر 1، اکتوبر 1931ء، ص نمبر ندارد

(10) راوی، لاہور: گورنمنٹ کالج، جلد 26، نمبر 3، جنوری 1932ء، ص نمبر: 2

(11) راوی، لاہور: گورنمنٹ کالج، جلد ندارد، نمبر ندارد، ماہ مارچ، اپریل 1932ء، ص نمبر: 3

(12) راوی، لاہور: گورنمنٹ کالج، جلد ندارد، نمبر ندارد، ماہ مارچ، اپریل 1932ء، ص نمبر: 5

(13) مقالات ن م راشد، مرتبہ، شیما مجید، اسلام آباد: الحمرا پبلشنگ، 2002ء، ص نمبر: 204

Vol. 3 No.1 2019

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022

(14) ایضاً ص نمبر:207

(15) ایضاً ص نمبر:208

(16) ایضاً ص نمبر:210

(17) ایضاً ص نمبر:212

(18) ایضاً ص نمبر:217

(19) ن م راشد، اداریہ، رسالہ شاہکار، لاہور: مئی 1935ء ص نمبر:2

(20) ایضاً ص نمبر:4

(21) ن م راشد، اداریہ، رسالہ شاہکار، لاہور: جون ۱۹۳۵ء ص نمبر:4

(22) ن م راشد، اداریہ، رسالہ شاہکار، لاہور: جولائی 1935ء ص نمبر:3

(23) ن م راشد، اداریہ، رسالہ شاہکار، لاہور: اگست 1935ء ص نمبر:3

(24) مقالات ن م راشد، مرتبہ، شیما مجید، اسلام آباد: الحمرا پبلشنگ، 2002ء ص نمبر 240

(25) ایضاً ص نمبر 242